جناب ڈاکٹر محمد امین

دعوت کی سیاست

ہمارے دین کی تعلیمات پوری انسانی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں خواہ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی لہٰذا اسلامی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ نہ صرف افراد اپنی ذاتی اور انفرادی زندگی اسلامی احکام کے مطابق گزاریں۔ بلکہ ان کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اجتماعی زندگی بھی اسی کے احکام کے مطابق گزاری جائے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ مسلمانوں کا ایک منظم معاشرہ ہو اور وہ اپنی ریاست اور حکومت رکھتے ہوں۔ جب ایسی ریاست موجود ہو تو مسلم حکمرانوں کا کام یہ ہے کہ وہ اسلامی احکام کے مطابق اس ریاست کا نظام چلائیں اور عام مسلمانوں فرض یہ ہے کہ وہ ان کی اطاعت کریں اور ان سے تعاون کریں۔ اگر مسلم حکمران پوری طرح اسلامی تعلیمات کے مطابق کام نہ کریں تو عام مسلمانوں اور علماء صلحا کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کی اصلاح کی کوشش کریں اور انہیں سمجھائیں لیکن اس وقت تک ان کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں جب تک وہ کھلم کھلا دین کی بنیادی تعلیمات پر عمل ترک نہ کردیں اور ان کی مخالفت نہ شروع کر دیں۔ اس صورت میں انہیں حق حاصل ہے کہ وہ ان کی اطاعت نہ کریں یا اگر ان کے پاس اتنی منظم طاقت ہو کہ وہ اس حکومت کو بدل سکتے ہیں تو اسے بزور بازو بدل دیں۔

اب موجودہ مسلم معاشروں کو دیکھیے بلکہ پاکستان ہی کی مثال لیجیئے کہ ہمارا آئین اسلام کی بالادستی کا اقرار کرتا ہے اور کئی آئینی ادارے اس کے لئے کام کر رہے ہیں اور بہت سے اسلامی قوانین یہاں نافذ ہیں۔ اور ہمارے حکمران آئے دن اسلام کے حق میں تقریریں کرتے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ ان حالات میں عوام اور علماء کے سامنے صرف یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ حکمرانوں کی اصلاح کی کوشش کریں (قرآن مجید کہتا ہے کہ تم پر اصلاح ہی کی ذمہ داری ہے..... ۱۱-۸۸) اور امام احمد اپنی مسند میں ایک حدیث لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے حکمران میں کوئی خرابی دیکھو تو تنہائی میں اس کو سمجھاؤ اگر تم نے ایسا کیا تو اپنا فرض ادا کردیا۔ (۳:۴۰۴) یا ان کے پاس اگر پرامن طریقے سے حکمرانوں کو ہٹانے کے مواقع میسر ہوں تو وہ انہیں فعال طریقے سے استعمال کریں اور ان کی بجائے نیک اور اہل تر لوگوں کو برسر اقتدار لائیں۔ اسلامی سیاست کے یہ وہ بنیادی اصول ہیں جنہیں ہم نے سادہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ پچھلے تیرہ سو سال سے جمہور امت کا اسی پر عمل رہا ہے کہ سوائے شروع کے اکادکا واقعات کے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے صدیوں عروج کا زمانہ دیکھا، مسلمان معاشرہ پچھلے چودہ سو سال سے بلا انقطاع قائم ہے بلکہ آج بھی اسلام دنیا کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے اور مسلمان دنیا کی ایک بہت بڑی طاقت ہیں اور بحیثیت ایک دین اور ملت کے یہ کوئی معمولی کامیابیاں نہیں ہیں شروع کے جن اکادکا واقعات کیطرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس میں اسلام کے ابتدائی عہد میں حضرت حسین ابن علی اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کی مزاحمتی کوششیں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سیاسی حکمت عملی کی بات تھی کہ اپنے حکمرانوں کی اصلاح کیسے کی جائے اور انہیں کیسے ہٹایا جائے، کوئی اسلام اور کفر اور حق و باطل کا مسئلہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سارے

جلیل القدر صحابہ کرام نے حضرت معاویہ اور یزید کی بیعت کی تھی.....ان کی کمزوریوں کے باوجود اگر یہ کوئی گناہ کا کام ہوتا تو سارے صحابہ کرام اس میں ہر گز شامل نہ ہوتے بلکہ خود حضرت حسین نے بھی، جب ان کو گھیر لیا گیا، تو مخالف سردار فوج سے کہا تھا کہ میرا راستہ چھوڑ دو، میں خود جا کر یزید سے بات کر لیتا ہوں مجھے جہاد کے کسی محاذ پر چلا جانے دو یا کم از کم واپس جانے دو لیکن ان کی بات نہ مانی گئی چنانچہ انہیں لڑنے پر مجبور کیا گیا اور گھیر کر ظالمانہ طریقے سے شہید کر دیا گیا۔ حضرت حسین کی عظمت یہ تھی کہ قلیل تعداد اور گھرے ہونے کے باوجود انہوں نے جبر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا اور اپنا اور اپنے ساتھیوں کی جان کا نذرانہ پیش کر کے ایک خاندانی اور بہادر آدمی کی طرح لڑ کر شہید ہونا منظور کر لیا لیکن یہ ثابت کر دیا کہ کہ ان جیسے آدمی سے تلوار کی نوک پر کوئی بات نہ منوائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ بعد کی صدیوں میں بھی تابعین، تبع تابعین اور علماء و صلحائے امت کا ہمیشہ یہی رویہ رہا کہ اگر حکمران اچھا ہو تو اس کے اچھے کاموں کی تعریف کی اور اس کے ساتھ تعاون کیا اور اگر حکمران اسلامی لحاظ سے ناپسندیدہ ہوا تو اسے سمجھانے کی اور اس کی اصلاح کی کوشش کی لیکن انہوں نے کبھی سیاسی جماعت بنا کر اور عوام کو ساتھ ملا کر محاذ آرائی سے یا بزور بازو ان کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ نیز علماء و صلحائے امت نے ماضی میں اس بات کو بھی کبھی پسند نہیں کیا کہ وہ خود اقتدار کے خواہاں اور علم بردار بن کر اٹھ کھڑے ہوں اور اس مقصد کے لئے مسلمان حکمرانوں سے مزاحمت اور کشمکش کریں۔ یہ تو موجودہ صدی (عیسوی) کی بات ہے کہ خلافت کے خاتمے کے بعد جب مغربی ممالک نے اکثر مسلم ممالک پر استعمارانہ قبضہ کر لیا اور اپنا سیاسی نظام بھی وہاں نافذ کر دیا تو سب سے پہلے مصر میں الاخوان المسلمون نے انگریزوں کے زیر اثر ہونے والے جمہوری انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور بعد میں دوسرے لوگ بھی اس راہ پر چل نکلے۔ گویا دینی عناصر کا سیاسی جماعتیں بنانا اور جمہوری پروسیس میں حصہ لینا ایک طرح سے مجبوراً مغربی استعمار کی وکٹوں پر کھیلنے کی بات ہے نہ کہ یہ پسندیدہ یا راجح اسلامی طریق سیاست ہے۔ رہا یہ کہ دینی عناصر اس تجربے کی ناکامی کو کیوں نہیں محسوس کر رہے تو عرض یہ ہے کہ محسوس تو وہ بھی کر رہے ہیں بس ابھی تک وہ اس موڑ پر نہیں پہنچے جہاں وہ ایک شجاعانہ فیصلہ کر کے اپنی سیاسی حکمت عملی کا رخ موڑ دیں کیونکہ ایسے فیصلے آسان نہیں ہوتے۔

مشہور مصری مفکر اور اخوانی رہنما جناب محمد قطب سے ایک دفعہ ایک جریدے نے سوال کیا کہ سید قطب شہید اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کیا سوچ رکھتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ جیل میں یہ سوچتے تھے کہ مصری عوام نے ابتلا کے وقت اخوان کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ مرحوم سید اسعد گیلانی اور مولانا سید وصی مظہر ندوی نے ہمیں بتایا کہ مولانا مودودی مرحوم سے اس موضوع پر ان کی بات ہوئی تھی اور یہ کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مولانا بھی اپنی سیاسی حکمت عملی سے تقریباً مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی بیماری، کمزوری، عملی سیاست میں نہ ہونے، محض اعلان کو سودمند نہ سمجھنے اور اس ضمن میں عملاً کوئی کردار ادا کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہونے کی وجہ سے مولانا نے کوئی اعلان کرنا مناسب نہ سمجھا البتہ ۱۹۴۸ء میں جب وہ یہ سیاسی حکمت عملی اپنا رہے تھے تو انہوں نے اس وقت اعلان کر دیا تھا کہ ہم نفاذ اسلام بذریعہ سیاسی قیادت کی تبدیلی (یا اوپر سے نیچے کی طرف تبدیلی) کی حکمت عملی اپنا تو رہے ہیں لیکن اگر ہمیں اس طریقے سے کامیابی نہ ہوئی تو ہم دوسرا رستہ یعنی پہلے دعوت و اصلاح کے

ذریعے عام معاشرے کی اصلاح اور پھر اس کے نتیجے میں سیاسی تبدیلی کی حکمت عملی اپنالیں گے۔ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء)۔ اسی لئے ہم دینی سیاسی جماعتوں کے کارپردازوں اور اہل علم کے سامنے یہ بات رکھ رہے ہیں کہ وہ وقت آگیا ہے کہ موجودہ سیاسی حکمت عملی کی ناکامی کو تسلیم کرلیا جائے اور اس پالیسی کو بدلنے کا بہادرانہ فیصلہ کر لیا جائے اور کام کو کرنے کا جو صحیح طریقہ ہے یعنی دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت پر ترکیز کے ذریعے پہلے درجے میں معاشرے میں گراس روٹ لیول پر تبدیلی اور پھر اس کے ذریعے سیاسی تبدیلی۔

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت پر ترکیز کا راستہ اختیار کیا جائے تو پھر سیاست کی آخر گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اور کیا یہ دین کا ناقص تصور نہیں کہ اس میں سیاست اور اجتماعیت کو اہمیت نہ دی جائے جیسا کہ تبلیغی جماعت اور بعض اہل تصوف اور دوسرے گروہ کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ مفروضہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دعوت و اصلاح کو بنیاد بنانے کا مطالبہ یہ ہر گز نہیں ہے کہ سیاست و اجتماعیت کو اہمیت نہ دی جائے۔ دراصل مروجہ سیاسی طریق کار اس طرح ذہنوں میں رچ بس گیا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرے کسی طریق کار کا تصور کرنا بعض لوگوں کو مشکل نظر آتا ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ شائد یہ قرآن مجید میں لکھا ہوا ہے کہ موجودہ طرز کی سیاسی جماعتیں بنائی جائیں اور انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ حالانکہ یہ اصول کی نہیں محض فروع کی بات ہے۔ نص پر مبنی حکم شرعی نہیں محض طریق کار اور حکمت عملی کی بات ہے۔ اسے اپنایا بھی جاسکتا ہے، جزواً تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے، اور بالکلیہ چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔ اسی لئے ہم کہہ رہے ہیں کہ جب تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ جمہوری طرز حکومت میں سیاسی جماعتیں بنا کر اور انتخابات میں حصہ لے کر نفاذ اسلام کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں تو ناگزیر ہے کہ اسے غیر موزوں سمجھ کر ترک کر دیا جائے اور اس طریق کار کی طرف لوٹ جایا جائے جس پر پچھلی تیرہ صدیوں میں جمہور امت اور سلف صالح نے عمل کیا ہے۔

اس کی دو عملی صورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ دینی عناصر مل کر ایک پریشر گروپ بنالیں اور اپنے مطالبات بتدریج حکومت سے منوائے جائیں۔ موجودہ طرز کی سیاسی جدوجہد میں وہ متحد نہیں ہوپاتے کیونکہ ہر دینی سیاسی جماعت کا لیڈر اپنے اور اپنی پارٹی کے لئے کامیابی اور اقتدار چاہتا ہے لہذا دوسری دینی جماعتوں کو اپنا حریف سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ مل بیٹھنا یا سمجھوتہ کرنا اس کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوتا پھر اسٹیبلشمنٹ سے بھی ان کو باہم لڑائی رہتی ہے کیونکہ وہ ان کے بھی حریف ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری تجویز کے مطابق اگر کرسی اور اقتدار کا خیال ہمارے علماء اور دینی رہنماؤں کے ذہن سے نکل جائے اور اس دوڑ میں وہ "غیر دینی" سیاسی جماعتوں کے حریف نہ رہیں تو وہ بھی ان کے معاملے میں کچھ نرم پڑ جائیں گے اور نتیجتاً علماء کا اتحاد ممکن ہوسکے گا۔ ہماری رائے میں اس طرح کا عملی سیاست میں براہ راست حصہ نہ لینے والا دینی عناصر کا پریشر گروپ بہت کامیاب ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے ووٹ بنک کو جمع کر کے انتخابات کے وقت موثر سیاسی جماعتوں کے سامنے اپنے مطالبات رکھ کر منوا سکتا ہے۔

اور اس طرح پاکستان کی اسلائزیشن میں ایک اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ اگر کوئی سیاسی جماعت ان کے ساتھ بد عہدی کرے گی تو وہ اگلی دفعہ اس ووٹ بنک سے محرومی کا خطرہ مول لے گی۔ اس طرح سیاسی جماعتوں میں اس ووٹ بنک کے لئے ایک مسابقت شروع ہوجائے گی۔ اور یہ چیز دینی جماعتوں کے پریشر گروپ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی

کیونکہ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ اسلامی مطالبات منوا سکے گا۔ اس طریق کار کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ علماء اور دینی عناصر کو اپنی ساری صلاحیتیں اور وسائل دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کے کاموں پر لگانے کا موقع ملے گا۔ اور اس طرح مزید مساجد اور مدارس قائم ہوں گے۔ سکول اور کالج کھلیں گے۔ اسلامی لٹریچر میں اضافہ ہوگا۔ دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں بڑھیں گی اور ان سب کے نتیجے میں انشاء اللہ نہ صرف عام لوگوں کی اصلاح ہو گی اور معاشرے میں دینی بہار آئے گی بلکہ طبقہ امراء اور خواص خصوصاً حکمران طبقوں میں بھی اسلام کے اثرات پہنچیں گے جو موجودہ صورت میں اس لئے ممکن نہیں کہ علماء جب حکمران طبقوں کے سیاسی حریف بن جاتے ہیں تو اسلامی لحاظ سے ان پر اثر انداز ہونے کے راستے بند ہوجاتے ہیں اور ان کے لئے موثر دعوتی و اصلاحی کام نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ علماء موثر سیاسی جماعتوں میں شامل ہوجائیں یا ان کی حمایت کا اعلان کردیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ یہ سیاسی جماعتیں جن پر اس وقت دنیا داری کا غلبہ ہے دین اور اہل دین کے قرب آنے لگیں گی۔ علماء جب بتدریج انکی ہر سطح کی قیادت میں شامل ہوں گے تو وہاں مختلف مسائل میں ان کی رائے بھی سامنے آئے گی۔ جو ان جماعتوں کی کارکردگی پر اثر انداز ہوگی۔ نیز اگر علماء کا کردار اچھا ہو اور ان کے ہر وقت کے روابط ان سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ہوں تو لامحالہ یہ ان پر اخلاقی لحاظ سے بھی اثر انداز ہوں گے اور اس طرح انہیں اس طبقہ خواص تک حکمت کے ساتھ دین پہنچانے اور ان کی دینی اصلاح کرنے کا موقع ملے گا جو موجودہ طرز سیاست میں ممکن نہیں ہے۔ امید ہے ہماری ان گزارشات سے ان معترضین کی تشفی ہوجائے گی جو یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت و اصلاح کی بنیاد پر کسی سیاسی سرگرمی کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم اس طرح کی لاحاصل خوش فہمیوں اور نعرے بازیوں کا حشر پچھلے پچاس سال سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ سنجیدہ دینی عناصر ہر طرح کی لایعنی خوش فہمیوں اور نعرے بازیوں کے چنگل سے نکلیں اور اپنے طریق کار میں بنیادی تبدیلیاں لانے پر غور کریں تاکہ پاکستانی معاشرے کو ایک حقیقی اسلامی معاشرہ بنایا جاسکے۔

بقیہ دل کی بات

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے!

جے یو آئی سیاست سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر رہی: مولانا فضل الرحمن

کراچی (مانیٹرنگ ڈیسک) جمعیت علماء اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمان نے کہا ہے کہ ان کی جماعت سیاست سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر رہی۔ انہوں نے کہا کہ سیاست ہماری نظر میں دین ہے اور اسے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ "بی بی سی" سے انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ ہم بڑے مثبت انداز میں ملکی نظام کو تبدیل کرنے کی جدوجہد میں شامل ہیں اور اپنے طرز عمل سے ہمیشہ "جمہوریت" کی بقاء کی جنگ لڑی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ ہم فکر و نظر کے اعتبار سے "جمہوریت" کی نفی کرتے ہیں یا "انتخاب" سے انکار کرتے ہیں۔ (نوائے وقت ملتان ۴ جون ۱۹۹۷ء)